اقبالیاتی ادب

علمی مجلّات کے مقالات کا تعارف

ادارہ

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ''اقبال کی عصری تلمیحات''، اخبار اُردو، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۷ء، ص۲-۶۔

جدید شاعری میں عصری تلمیحات کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اقبال کو اگر ایک مفکر اور ایک مبلغ اعظم قرار دیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ شاعری میں اپنی ذات سے منسلک بعض معروف افراد و وقایع کا ذکر کرنے کے علاوہ دنیا کے نقشے پر رونما ہونے والے احوال و حوادث کا بیان کرنے پر یکساں قادر ہیں۔ ایسی تلمیحات اقبال کے پسندیدہ اشخاص کا نشان یا سراغ دیتی اور ان کے عصری شعور کی عکاس ہونے کے سبب سے انھیں ماقبل کے شعرا پر فائق بھی ٹھہراتی ہیں۔ علامہ کی پیش کردہ عصری تلمیحات میں علمی و ادبی سیاسی و سماجی شخصیات کا تذکرہ اہم ہے جس کو متعارف کراتے ہوئے وہ تحسینی و تردیدی ہر دو طرح کے انداز اپناتے ہیں۔ علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ سیاسی شخصیات کو بھی اقبال بطور تلمیح اپنے کلام میں لائے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ تلمیحات ان کے دور کے سیاسی و تہذیبی منظر نامے کا نقشہ اتارنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اقبال کی تلمیحات و اشارات کو دیکھنے کے بعد ایک ہی رائے قائم کرنی پڑتی ہے، اور وہ یہ کہ ان کا ایک پیغام ہے ایک نصب العین ہے۔ اسی پیغام اور نصب العین کو عام کرنے کے لیے وہ تاریخ عالم کی بعض شخصیات اور تحریکوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان شخصیات اور تحریکوں میں سیاسی، تاریخی، ادبی، اخلاقی، مذہبی اور فلسفیانہ پہلو شامل ہیں جن سے ان کے نصب العین کی تائید ہوتی ہے۔

☆☆☆

رفعت سروش، ''اقبال شاعر رنگ و بو''، اخبار اُردو، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۷ء، ص۷-۱۲۔

اقبال کا کلام مناظر قدرت کا چمنستان ہے۔ پہاڑ، دریا، آبشار، صبح، شفق، رنگ، خوشبو، پھول، پرندے سب کچھ ان کی شاعری میں ہے۔ اقبال سیاسی افکار کے اعتبار سے ہی شاعر مشرق نہیں ہیں بلکہ صحیح معنوں میں شاعر مشرق ہیں۔ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کے دلدادہ، صبح کے مناظر کے والا و شیدا، شفق کی سرخی ان کے دیوان میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہے۔ اسی طرح پھولوں کی سرخ پوشاک کی جلوہ گری

اور رنگا رنگ پھولوں کی سج دھج ان کی شاعری کو پر بہار کرتی ہے۔ ہمالہ، گل رنگین، ذوق وشوق، ساقی نامہ جیسی نظمیں اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ علامہ اقبال فطرتاً رجائیت پسند ہیں اور اپنے آپ کو موج نسیم سحری سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھولوں میں زندگی گزارنا ان کی فطرت ہے اور یہی پیغام اپنے بیٹے جاوید کو دیتے ہیں جو دراصل پوری قوم بلکہ دنیا کے نوجوانوں کے لیے ہے۔ اقبال کی نگاہ نکتہ شناس مظاہر فطرت کو حرف حرف پڑھتی ہے اور گل لالہ کی پتی پر وہ اسرار حیات کا مطالعہ کرتی ہے۔ اور یہ مطالعہ علم کتابی سے کہیں زیادہ بامعنی ہے۔ گل لالہ کے استعارے کو اقبال نے مختلف نظموں میں مختلف معنوں میں پیش کیا۔ غرض کہ کلام اقبال میں رنگ ونور ونکہت کا ایک جہاں آباد ہے اور اقبال کی خلاق طبیعت نے ان علائم کو بڑے فنکارانہ انداز سے استعمال کیا ہے۔ اقبال کا مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ وہ محض شاعر نہیں بلکہ فلسفی بھی ہیں۔ اس لیے ان کے بظاہر مناظر قدرت اور گل وبلبل کے متعلق جو اشعار ہیں ان کا ایک مصرع کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور دوسرا اس کی نفی یا تشکیک کا پہلو نمایاں کر دیتا ہے۔ اقبال سے پہلے شعرائے کرام نے مناظر قدرت کو نظم کیا مگر اقبال نے اس میدان سخن میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ بے مثال ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اشرف کمال، ''علامہ اقبال اور قومی زبان اُردو''، اخبار اُردو، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۲۱-۲۵۔

بیسویں صدی میں اردو زبان اور مسلم تہذیب وثقافت کے تحفظ کے لیے جن شخصیات نے بھرپور کردار ادا کیا ان میں سے ایک علامہ اقبال بھی ہیں۔ اقبال کو مشرقی رسوم ورواج اور اردو زبان سے والہانہ لگاؤ تھا۔ علامہ اقبال انگریزی، جرمنی، عربی، فارسی اور پنجابی زبان پر دسترس رکھنے کے باوجود اردو زبان کو پسند کرتے تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک اردو زبان برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی تہذیبی وثقافتی روایات اور ورثے کی امین تھی۔ اقبال کی علم الاقتصاد اردو میں اپنی اولیت اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ اقبال نے اردو زبان میں اس قدر تخلیقی کام کیا ہے کہ اب اقبال اور اردو ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہو گئے ہیں۔

علامہ اقبال برصغیر کے مسلمانوں کے لیے زبان کی اہمیت اور نزاکت سے پوری آگاہی رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو زبان کے تحفظ اور دفاع سے غفلت نہ برتی جائے اس زبان میں نت نئے علمی وادبی امکانات کو راستہ دیا جائے۔ علامہ اقبال نے اپنی انگریزی، فارسی، عربی زبان پر مہارت کو اردو زبان کی توسیع وترقی کے لیے استعمال کیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر اشرف کمال، ''اقبال: عشق ونظریۂ تحرک''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۵-۱۲۔

عشق انسان اور کائنات کے اندرونی ارتقا میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کائنات کی ہر شے میں عشق کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ عشق ایک مکمل فلسفہ حیات کا نام ہے جو انسانی جذبوں اور لطیف احساسات کو زندگی کی تابندہ پائندہ بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ اقبال عشق سے تسخیر کائنات کا کام لیتا ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح نام نہاد رسمی عشق کا قائل نہیں بلکہ اس کا عشق زندگی کا ایک زبردست محرک ہے۔ اقبال نے عشق کے نظام جذب وکشش کو نیا اور وسیع تر فلسفیانہ مفہوم عطا کیا ہے۔ انھوں نے تاریخی شعور سے کام لیتے ہوئے اپنی فکر کو مستحکم بنیادیں فراہم کی ہیں۔ اقبال کے نزدیک عقل انسان کو فطرت اور کائنات کی غلام بنا دیتی ہے جب کہ عشق انسان کو تمام پابندیوں سے چھٹکارا دلا کر اسے رنج وغم سے دور کر دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق سوز وتب وتاب جاودانہ کے سوا کچھ نہیں ہے اور عشق کا یہ سوز اور تڑپ اقبال کے مردمومن ہی میں اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔ گویا مردمومن کائنات کی تڑپ کا نمایندہ ہے۔ اقبال کا عشق انھیں عشق رسول تک لے جاتا ہے۔ یہ عشق ان کے قلب وجگر میں اطمینان اور سکون کا باعث ہے۔ علامہ اقبال عشق کو ایک نصب العین کے طور پر اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اقبال زندگی کو حرکت سے تشبیہہ دیتے ہیں اس تحرک میں عشق اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی تمام شاعری ذوق عمل کی سرمستیوں کی ترجمان ہے۔

☆☆☆

محمد سرور، ''میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر''، اُردو ڈائجسٹ، لاہور، دسمبر ۲۰۰۷ء، ص ۲۳۱-۲۳۲۔

علامہ اقبال ایک عظیم شاعر اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ انھوں نے ملت اسلامیہ کو ایک عظیم پیغام دیا۔ اقبال قدیم وجدید انسانی معاشروں اور شرق وغرب کے کئی علوم اور فکری تحریکوں پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان کے پیغام اور دعوت کی اساس قرآن مجید اور اس کی علمی تفسیر فلسفہ خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی سے مراد خود شناسی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اقبال کی فکر کا اصل سرچشمہ قرآن اور مرکز فکر خودی ہے۔ اقبال کے کلام کی ایک خصوصیت منظر نگاری ہے۔ انھوں نے واردات قلب، جذبات قلب اور نکاتِ فلسفہ کو دلکش اور مؤثر بنانے کے لیے منظر نگاری سے کام لیا ہے۔

☆☆☆

حکیم راحت نسیم سوہدروی، ''علامہ اقبال مسجد قرطبہ میں''، میثاق، لاہور، نومبر ۲۰۰۷ء۔

فتح اندلس کا دور امت مسلمہ کے لیے مسرت انگیز تھا، مگر دوسرا پہلو المناک ہے کہ جب اندلس کے ان مجاہدوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ وہ عقیدۂ توحید اور امامت عالم کے امین ہیں تو خداوند لاشریک نے بھی انھیں فراموش کر دیا۔ اس زوال کا سبب داخلی اتحاد کی کمزوری اور شمشیر وسناں کو چھوڑ کر

طاؤس و رباب کا دلدادہ ہونا تھا۔ اسلامی اقتدار کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ مساجد پر فاتح راہبوں نے قبضہ جما لیا۔ اس طرح مسجد قرطبہ بھی عیسائی راہبوں کے تسلط میں آ گئی جنھوں نے اسے گرجا میں تبدیل کر دیا۔ منبر اور دیوان میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ البتہ اذان اور نماز پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تقریباً آٹھ صدیاں گزرنے پر علامہ اقبال کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہوا کہ انھوں نے اس پابندی کے باوجود مسجد قرطبہ میں نہ صرف اذان دی بلکہ نماز ادا کی۔ اگرچہ اس حوالے سے اقبال کی کوئی تحریری شہادت نہیں تاہم تصویری ثبوت موجود ہے۔ مسجد قرطبہ میں بنائی گئی اقبال کی دو تصاویر ہیں جو روزگار فقیر ص ۴۸، ۴۹ پر موجود ہیں۔ یہ تصاویر مسجد کے اس مقام پر لی گئیں جو بڑی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ پتا چلتا ہے کہ علامہ اقبال نے نماز ادا کرنے کے لیے مسلمانوں کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو ذہن میں لاتے ہوئے اس جگہ کا انتخاب کیا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ نے طے شدہ پروگرام کے مطابق نماز ادا کی، یہ کسی اضطراری حالت کا نتیجہ نہیں جیسا کہ بعض تذکرہ نگار یہ تاثر دیتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ''اقبال کی مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۷، ص ۲۷-۳۳۔

کلام اقبال میں اسلام، یہودیت، عیسائیت، بدھ ازم اور ہندوازم کے علاوہ سکھوں، پارسیوں اور بابیوں کے مذاہب و مسالک سے منسلک مختلف اشخاص و واقعات اور تصورات کو توسیع و ترسیل مطالب کے لیے غیر معمولی بے ساختگی اور رچاؤ سے تلمیح کیا گیا ہے۔ اسی طرح تصوف کے بنیادی نظریات، اصطلاحات اور نمایندہ صوفیا کی تلمیحات جا بجا ہیں۔ بعض اوقات اقبال اسلامی تلمیحات کے ساتھ دیگر مذاہب کی تلمیحوں کو آمیخت کر کے حیران کن نتائج کا استخراج کرتے ہیں اور ایسی ملی جلی تلمیحات میں ان کا اسلوب خاصا مدلل بھی ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ادیان اور مسلکوں کا تذکرہ شعر اقبال میں آتا بھی اس لیے ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت اور اکملیت کو تقابل سے عیاں کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر اقبال کی صوفیانہ تلمیحات اس لیے بھی لائق استحسان ہیں کہ ان کی وساطت سے علامہ نے ایک ایسے دور میں تصوف کے متداول و مرغوب نظریے وحدۃ الوجود کا ایراد کیا جب اس کے خلاف لکھنا ایک بہت بڑی بدعت شمار کیا جاتا تھا۔ اندریں حالات اس کے مقابلے میں اثبات خودی کا تصور پیش کر کے انھوں نے مروجہ طریق سے انحراف کیا۔ گویا اقبال کی مذہبی و صوفیانہ تلمیحات پیغامبری کا مؤثر ذریعہ قرار پانے کے ساتھ ساتھ اس دور کے ہندوستان کے مذہب و تصوف پر مبنی تصورات کو سمجھنے میں ممد و معاون ٹھہرتی ہیں۔

☆☆☆

سید ظفر رضوی، ''اقبال کا تصور اسلام''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۳۵-۴۳۔

تعلیم، شاعری، فلسفہ اور سیاسیات وہ چار بنیادی ستون ہیں جن سے ہم اقبالیات اور اقبال کے تصور اسلام کا منظر دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔ اقبال کے تصور اسلام کے عنوان میں تصور کے عام لفظ کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ تصور کے لغوی معنی ہیں دل میں تصویر بنانا، دھیان، مراقبہ، خیال، منطق کی اصطلاح میں کسی چیز کا حکم کے بغیر عقل میں آنا۔ اقبال کے تصور اسلام میں ہر انسان اپنے اخلاق کو حسن بخش سکتا ہے اور اس میں خودداری، مساوات، انکساری، وسعت نظریہ، اطمینان اور عقل، رجائیت، توکل، ضبط نفس اور خوش مزاجی جیسی خوبیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اقبال کے تصور اسلام میں عام انسانوں کو بھی حسن ارادت کی شمع جلائے رکھنے کا عملی ثبوت ملتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اقبال کا تصور اسلام مناجات، تسبیحات کے اثر سے پر امن زندگی اور اطمینان قلب کی دولت کا وسیلہ ہے وہ کسی بھی الہام، وجدان، عرفان اور روحانی تجربے کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں جس سے انسانی وحدت پارہ پارہ ہوجاتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ضرب کلیم میں اسلام اور مسلمان کے عنوان سے بیشتر مختصر نظمیں تحریر کیں۔ جو ان کے افکار و خیالات اور نظریات کی وضاحت کرتی ہیں۔ علامہ اقبال نے ہندوستانی خانقاہیت کو بھی برہمنیت سے آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ علامہ اقبال کے تصور اسلام کو سمجھنے کے لیے یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ انھوں نے مشرقی ملائیت اور مغربی ملائیت پر تنقید کے ساتھ ساتھ عالمی سطح کے ظالمانہ نظام اور اس کی پیدا کردہ تہذیب و تمدن پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اور روح عصر کو اصل تصور فطرت سے ہم آہنگ رکھنے کی آرزو کو نمایاں کیا ہے۔ اقبال کے تصور اسلام کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے کلام کی نورانی کیفیت اور ان کی تقاریر و مضامین کی دانش برہانی کو اپنے فکر و خیال میں جگہ دینا ہوگی۔

☆☆☆

رابعہ سرفراز، ''کلام اقبال میں فکری و فنی ہم آہنگی''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۴۴-۴۹۔

اقبال کے اکثر ناقدین اس قسم کے بیانات کو بنیاد بناتے ہیں کہ وہ غزل کی زبان سے باخبر نہیں۔ حالانکہ اقبال کو سخن وری کا فن آتا ہے۔ اقبال کی غزل عام روایت کے برعکس ایک تصور پر مبنی ہے۔ اقبال مینا و جام کے شاعر نہیں بلکہ زندگی کے حقائق کے نغمہ خواں ہیں۔ تخلیق کا یہ کٹھن عمل عظیم فن کاری کے بغیر ممکن نہیں۔ تخلیقی آزادی شاعر کے مقصدِ تخلیق کی عطا ہے۔ اقبال کی شاعری شعر برائے شعر نہیں بلکہ صحیح معنوں میں زندگی کی تزئین ہے۔ اقبال کی اکثر نظموں میں غزل کی تکنیک استعمال کی گئی۔ اقبال کی شاعری محض بیان کی وسعت اور اخلاق کی اصلاح تک محدود نہیں ہے۔ اقبال جیسے منفرد فن کار سے روایتی اصناف، اسالیب، مضامین اور زبان کا تقاضا غلط ہوگا۔ ان کے کلام میں تغزل کی شان فوری طور پر پیدا ہونے والی

کیفیت ہے۔ بال جبریل اور ارمغان حجاز کی متعدد غزلیں غیر معمولی تغزل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ کلام میں موسیقیت گہری معنویت پیدا کرتی ہے۔ کلام اقبال کے شعری آہنگ میں وہی رنگارنگی ہے جو کائنات کے عناصر میں کارفرما ہے۔ اسی طرح اقبال تشبیہوں کے انتخاب میں آزادی سے کام لیتے ہیں اور تشبیہہ سے ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جو ذہن کو خود بخود اقبال کے پسندیدہ موضوع کی طرف مائل کرتی ہے۔ اقبال ایک ایسے ذہین فن کار تھے جنھوں نے اپنی شاعری میں تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور کامیاب رہے۔ ان کی شاعرانہ نظر نے بہت سے خواب دیکھے جو ان کی خوبصورت شاعری کی بنیاد ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر طاہر تونسوی، ''فکر اقبال کے ترقی پسندانہ زاویے''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۷، ص ۵۰-۵۴۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں جن خیالات وافکار کو منکشف کیا ہے اس کی تفہیم کے لیے اقبالیات کی اصطلاح وضع کی جا چکی ہے۔ انھوں نے جن تصورات اور نظریات کو شعر کے قالب میں ڈھالا اس کی وسعت، ہمہ گیری اور آفاقیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے کلام اقبال کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ علامہ کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ ان کے باطن میں جو دردمندی اور سوز تھا وہی ان کے فکری نظام کی اساس بنا۔ استحصالی طبقوں کے خلاف اقبال کی صدائے احتجاج سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کے ہاں ان ترقی پسندانہ رویوں کی ابتدا بانگ درا کی نظم 'خضر راہ' کے زیر عنوان سرمایہ محنت سے ہوتی ہے اور پھر اس کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ اور جوں جوں اقبال کا مطالعہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے ان رویوں اور زاویوں میں تیزی اور تندی آتی جاتی ہے۔ اقبال اپنی نظموں اور متفرق اشعار میں ان رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں سماج کے دشمنوں کی مذمت بھی ہے اور ان کے عزائم کو بے نقاب بھی کیا گیا ہے اور ''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے'' کا درس دیتے ہوئے انھیں ایسی منفی قوتوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی جانب واضح اشارات کیے ہیں۔

☆☆☆

کیفی حسینی، ''اقبال پھر اقبال ہے''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۷، ص ۵۵-۶۱۔

شعرائے اردو میں حالی واکبر کے بعد اقبال ہی واحد شاعر ہے جس نے ملت کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر اسے ذلت کے گڑھے اور مغربی افکار وتہذیب اور سرمایہ دارانہ حیلوں اور مغربی لادینی فلسفے کے معاشرتی ردعمل سے نکالنے میں اپنی عمر گزار دی۔ اقبال نے مسلمانوں کو مغربی فکر کے غلبے سے بچانے کی بجائے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا اور قدرت نے اقبال کی فکری تربیت کے لیے ایسے مواقع بھی فراہم کر دیے تھے کہ جس کے سبب اقبال نے مغربی افکار کو قیامِ یورپ کے دوران پورے شعور سے قلب کی نگاہوں سے دیکھا، جانچا، پرکھا اور ہندوستان واپسی کے بعد مغربی تہذیب وتمدن اور افکار کو ہدف تنقید

بنا کر ان عوامل کی نشاندہی فرمائی جو بظاہر بہت عظیم الشان نظر آتی تھی۔ اقبال کے نزدیک آرٹسٹ کا مقصد زندگی کی خدمت ہے۔ اقبال نے شعر کے ذریعے زندگی کی صحیح ترجمانی کی ہے اور حرکی عناصر کو خاص طور پر اجاگر کیا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں زندگی کی نسبت جس قدر تشبیہیں، استعارے، تراکیب استعمال کی ہیں ان کی مثال فارسی اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ زندگی کے موضوع کو فارسی اور اردو میں سب سے پہلے اقبال نے پیش کیا۔ اقبال کے کلام میں ندرت اور جدت کا پہلو ہے جو پہلے شعرا میں نسبتاً کم تھا۔ اقبال نے شاہین اور خودی کا تصور پیش کیا۔ اقبال کا فلسفہ خودی قرآنی تعلیمات سے ماخوذ ہے اور اس کے عناصر ترکیبی اطاعت وضبطِ نفس، نیابت الٰہی ہے۔ وہ حرکت وعمل اور جدوجہد کے نقیب ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی نام ہے تجلیاتِ کلیم ومشاہداتِ حکیم کا۔ اقبال نے ملت کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ تفکر کے ایسے ایسے اسلوب عطا کیے جو اقبال سے پہلے اردو شاعری میں عنقا تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ''مغرب پرستوں پر اقبال کی تنقید''، تکبیر، کراچی، ۸-۱۴ نومبر ۲۰۰۷، ص ۴۴-۴۶۔

اقبال ان لوگوں سے بے زار تھے جو نام ونسب کے مسلمان ہیں، جن کے دل ودماغ یورپ کے نظریات وافکار سے متاثر ہیں۔ بدقسمتی سے یہ طبقہ اقبال کی زندگی میں خاصی بڑی تعداد میں تھا اور دورِ حاضر میں بھی ساری خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ آج آزادی کے کم وبیش ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی اس طبقے پر اقبال کی تنقید میں روزِ اول کی سی تازگی نظر آتی ہے۔ آج پاکستانی قوم جن بے شمار بحرانوں میں مبتلا ہے اس کا سبب بھی یہی مغرب پرست طبقہ ہے اور پاکستان کی ساری تاریخ اس پر شاہد عادل ہے۔ اس طبقے سے وابستہ شعرا، ادبا، دانشور امریکہ کو گالیاں دیتے ہیں مگر امریکہ ہی ان کا آئیڈیل ہے۔ یہ طبقہ یورپ کی مدح وتحسین میں تو رطب اللسان رہتا ہے مگر یورپ کی خوبیوں کو قبول نہیں کرتا اور نہایت عاقبت نااندیشی اور حماقت سے وہاں کی خامیوں کو سینے سے لگاتا ہے۔ اقبال اس تلخ حقیقت سے بڑے پریشان تھے کہ مغربی تقلید نے خصوصاً مسلمان نوجوانوں سے ان کی ساری خوبیاں چھین کر انھیں عیش پسندی اور مادہ پرستی کی دلدل میں دھکیل دیا وہ شاہینی صفات کھو بیٹھے ہیں اور کرگس کی ہوس ناکی اور بدذوقی انھوں نے اختیار کرلی ہے۔ اس طبقے میں عام نوجوان ہی نہیں سیاست دان، حکمران، ذمہ دار افسران اور اساتذہ بھی شامل ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، ''حضرت انسان اور اقبال''، الاقربا، اسلام آباد، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۷، ص ۲۲-۲۸۔

مختلف ادیان کے انسان سے متعلق دو عمومی رجحان ہیں اول یہ کہ کچھ ادیان انسان کو کمزور، ناقص اور بے بس تصور کرتے ہیں۔ اس کی نجات ایک غیر متحرک جامد طرزِ عمل میں تجویز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں

انسانی عظمت کا تصور نفی ذات اور فنا میں پوشیدہ ہے۔ بدھ مت، ہندومت، عیسائیت، افلاطونی مکاتب فکر اور دورِ جدید میں وہ تمام سلسلہ ہائے فکر جن کی بنیاد محض عقلیت اور نری مادیت کی پیدا کردہ تشکیک اور تثلیت پر استوار ہے۔ دوم وہ ادیان جو انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں۔ ان میں اسلام سرفہرست ہے پھر زرتشت مسلم فلاسفہ وحکما میں ابن عربی، الجیلی، محمود شبستری، رومی، جامی، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ کے نام آتے ہیں۔ مغربی حکما میں نطشے فوق البشر کے حوالے سے نمایاں ہے۔ نطشے کا فوق البشر مسیحی الٰہیات کا ردعمل ہے۔

اقبال کی علمی توجہ، تحقیق اور تعبیر کا بنیادی موضوع حضرت انسان ہے۔ اقبال کے نظام فلسفہ کے اساسی عناصر یعنی خودی اور بے خودی، انسان کی حیثیت، دائرہ کار، اختیار اور علم اور ارادے کی حدود اور ان کے ہمہ پہلو نتائج سے متعلق نوع بہ نوع مباحث کی طرف اشارے کرتے ہیں۔

اقبال قدیم قصص میں بیان کردہ بے بس انسان سے مطمئن نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہبوط آدم کے قصے کی قرآنی صورت کو بے حد اہمیت دیتے ہوئے اس کی مثبت توضیح کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جس عمل کو انسان کی پہلی نافرمانی یا گناہ قرار دیا گیا وہ دراصل انسان کا پہلا اختیاری عمل تھا جس میں اس کا ارادہ شامل تھا۔ انسان کا زمین پر نزول سزا کے واسطے نہیں بلکہ یہ تو اس اعتماد کا اظہار ہے جو خالق نے اپنی مخلوق پر کیا۔ انسان کے اعمال، افعال متعین ہیں۔ اسے اختیار دیا گیا ہے۔ اس نفس متناہیہ کے سامنے خیر وشر دونوں راستے موجود ہیں۔ اسے اختیار ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ اقبال نے ہبوط آدم کے قرآنی تصور کی روشنی میں ایک لائحہ عمل پیش کیا جس پر عمل پیرا ہو کر انسان درجۂ کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ لائحہ عمل اسرار خودی اور رموز بے خودی کی مربوط شکل میں پیش ہوا۔

☆☆☆

محمد بدیع الزماں، ''کلام اقبال میں قم اور قم باذن اللہ کی معنویت''، دارالسلام، مالیر کوٹلہ، بھارت، نومبر ۲۰۰۷۔

''قم'' اقبال نے یہ اصطلاح مسلمانوں کی مردہ روح میں نئی جان ڈالنے کے معنوں میں استعمال کی ہے۔ قم باذن اللہ کے لغوی معنی ہیں: اللہ کے حکم سے اُٹھ، اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ضرب کلیم میں قم باذن اللہ نام کی نظم ہے۔ اقبال نے اس نظم میں مسلمانوں کو اللہ کے حکم سے سرگرم عمل ہونے کی تلقین کی ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال یہ بھی باور کراتے ہیں کہ تجھ میں سرگرم عمل ہونے کے لیے حسین ابن منصور حلاج کی طرح وہی خون موجود ہے جس نے نوائے انا الحق کو آتشیں کر دیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ فرنگی یعنی مغربی تعلیم نے تیرے مذہبی عقائد کو پراگندہ اور بے شعور کر دیا ہے مگر تو اللہ اور رسول کی زندگی بخش تعلیمات سے اس پراگندگی کو دور کر کے سرگرم عمل ہو کر فرنگیوں کے اس افسوں یعنی جادو کو توڑ سکتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ''اقبال کا کنائی اسلوب''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۲۰۷-۲۲۵۔

کنایہ دراصل پوشیدہ سخن گوئی، ترکِ تصریح یا کھل کر بات نہ کہنے کا ڈھب ہوتا ہے۔ اس میں لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں جو آپس میں لازم وملزوم ہوتے ہیں لہٰذا کہنے والا ان دونوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ سننے والے کا ذہن معنی نزدیک سے معنی بعید تک منتقل ہو سکے۔ کنایے کے ظاہر الفاظ و معانی ''مکنی بہ'' اور معنی مقصود ''مکنی عنہ'' کہلاتے ہیں اور ان دونوں کے معنوں کے درمیان ارتباط و انسلاک ضروری ہے۔ وہ کنایہ جس میں ذہن معنی منظور تک بہ آسانی رسائی کرے کنایہ قریب ہے اور وہ صورت جس میں واسطوں کی کثرت کے باعث ایسا کرنا بہ سہولت ممکن نہیں کنایہ بعید کہلاتا ہے۔ اقبال کے ہاں کنایہ قریب کی مثالیں ملتی ہیں۔ کنایے کی صورتیں صفت و موصوف کے اعتبار سے وضع کی گئی ہیں۔ علامہ نے بھی ان چار صورتوں کو متنوع رنگ و آہنگ سے پیش کیا ہے:

۱-تعریض: بنیادی طور پر عرضہ سے مشتق ہے جس کے معنی جانب یا طرف کے ہیں۔ اس کنائی وصف کے تحت شاعر یہ کوشش کرتا ہے کہ موصوف کا ذکر نہ کرے اور اشارہ ایک جانب سے کرے اور مراد دوسری جانب ہو۔ علامہ کے تعریض پر مبنی اشعار بڑے جاندار اور دوٹوک ہیں (۲) تلویح کے لفظی معنی دور سے اشارہ کرنے کے ہیں۔ اسے ایک اعتبار سے کنایہ بعید سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے اقبال کنایے کے ذریعے پوشیدگی اور پیچیدگی پیدا کر کے اپنے کلام کو زیادہ بلیغ اور بامعنی بنا دیتے ہیں اور ان کے تلویحاً رقم کیے گئے ان کثیر الجہاتی اشعار پڑھنے والا داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۳) رمز کے لفظی معنی راز، اشارہ یا علامت کے ہیں۔ اس کے برعکس رمز کے پس منظر میں ایک ہی مطلب ہوتا ہے جو زیادہ تر طے شدہ اور ہمارے اجتماعی شعور کا حصہ ہوتا ہے۔ اقبال کے ہاں رمز کی صورت گراں خواب چینی، شراب، الست سے شاعر نے بالترتیب مقصد کے حصول میں نہ ہونے، افیون کے نشے میں ڈوبے اہل چین، روز ازل خدا سے انسان کا عہد و پیمان کے معانی مراد لیے ہیں۔ اور ان تمام مطالب کی جانب انتقال ذہن بہت دشوار نہیں ہے۔ (۴) ایما کے معنی اشارے کے ہیں۔ اسے کنایہ قریب یا کنایہ واضح یا آشکار سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے کنایے کی ایمائی صورت کو بکثرت پیوند کلام کیا ہے۔

☆☆☆

محمد سرور، ''عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام''، اُردو ڈائجسٹ، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۶-۱۷۸۔

علامہ اقبال کے نظام فکر میں عشق کو ایک بنیادی مقام حاصل ہے۔ وہ عشق کو بے پایاں لگن کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ایک ایسی لگن جو راستے میں آنے والی مشکلات اور تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتی بلکہ پوری قوت اور جدوجہد کے ساتھ منزل کی جانب اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اقبال نے عشق

کے مفہوم میں بڑی گہرائی اور وسعت پیدا کر دی۔عشق کی بدولت ایک شخص اپنی خودی سے آگاہ ہوجاتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اللہ کا نائب ہے۔عشق کی بدولت جب شانِ فقر پیدا ہوگیا تو ایک عالم اس کے زیرنگین ہوگیا۔آہ سحرگاہی اقبال کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد صبح کے وقت آہ وفریاد ہے اقبال اس سے مراد عاشقانہ زندگی لیتے ہیں۔تنہا علم بے سود ہے جب تک اس کے ساتھ مخلصانہ عمل موجود نہ ہو۔اس کے لیے آہ سحرگاہی از حد ضروری ہے۔اسی طرح لاہوت تصوف کی ایک اصطلاح ہے یعنی سالک کی آخری منزل جہاں اسے فنا فی اللہ کا مرتبہ حاصل ہوجاتا ہے۔طائر لاہوتی سے مراد مسلمان ہے۔طائر لاہوتی سے مراد یہ ہے کہ مسلمان کا مقصد حیات اس بلند روحانی مقام کا حصول ہے جہاں پہنچ کر اس کے اندر اللہ کی صفات کا پرتو نظر آنے لگے جسے تصوف کی اصطلاح میں فنا فی اللہ کا مرتبہ کہتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد معز الدین، ''اقبال کا پیغام قوم کے نوجوانوں کے نام''، تہذیب الاخلاق، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۱۱-۱۸۔

اقبال پیرانِ کہن سے ناامید ہوگئے تھے اور انھوں نے اپنی تمام تر امیدیں نوجوان نسل سے وابستہ کر لی تھیں۔ چونکہ اقبال اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی بازیافت کے لیے قوم کو تیار کر رہے تھے، لہٰذا ان کے پیش نظر پوری نسل کی فکری، اخلاقی اور ذہنی تربیت تھی۔اس مقصد سے انھوں نے بچوں کے لیے بھی دل پذیر اور سبق آموز نظمیں لکھیں۔اس طرح تدریجی طور پر شاہین بچوں سے لے کر نوجوانوں اور پھر قوم کے ہر فرد کو وہ مردمومن کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔اقبال نوجوانوں میں ذاتی جوہر پیدا کرنا چاہتے تھے ان میں یہ صفت حفاظتِ خودی کے ذریعے حاصل ہوسکتی تھی۔اقبال کو نوجوانوں کے تعلیمی مسائل اور جدید تعلیم کے منصوبے اور رجحانات اور اثرات کی بڑی فکر تھی۔ان کو خداوندانِ مکتب سے سخت شکایت تھی کیوں کہ دنیاوی مفاد کی تعلیم تو دی جاتی ہے مگر نوجوانوں کی روح میں ایمان کی حرارت نہیں پہنچتی۔اعلیٰ اخلاقی قدروں سے عاری نوجوانوں کو دیکھ کر علامہ اقبال سخت دل گرفتہ ہوتے تھے۔''سخنے بہ نژادنو'' کے تحت جو اشعار انھوں نے لکھے وہ نوجوانوں کے لیے حد درجہ سبق آموز ہیں۔''خطاب بہ جوانان اسلام''، کے عنوان سے نظم بھی نوجوان نسل کے نام پیغام سے لبریز ہے۔

☆☆☆

محمد سرور، ''اقبال کا تصور علم و عقل اور عشق''، اُردو ڈائجسٹ، لاہور، فروری ۲۰۰۸، ص ۱۶۴-۱۶۶۔

اقبال عشق کو علم، عقل اور حکمت کے مدمقابل یا ان سے بالاتر خیال کرتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ عقل کو عشق کے تابع خیال کرتے ہیں۔ وہ معرفت اور عرفان کے قائل ہیں اور حصول علم کا مقصد بھی یہی خیال کرتے ہیں۔ عشق اقبال کی باطنی زندگی میں ارتقا پا کر عشقِ رسول بن گیا۔ اگر عقل دلیلوں سے کام لیتی ہے تو اس کے مقابلے میں عشق سے انسان ذات باری تعالیٰ کا دیدار کرسکتا ہے۔ جب تک دل دنیاوی آلائشوں سے لتھڑا رہتا ہے اس وقت تک حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ آنکھ کے نور سے صرف چیزوں کی ظاہری شکل وصورت نظر آتی ہے لیکن دل کے نور سے چیزوں کی اصل حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ اقبال کو دلی افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ جن کے دلوں میں جذبہ عشق فروزاں ہو، خدمت اسلام اور جہاد کا جذبہ موجود ہو۔ انھیں کوئی صاحبِ عشق نظر نہیں آتا۔ اقبال دل بیدار پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں کیوں کہ اسی سے باطل قوموں کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

مشتاق احمد تنولی، ''براؤننگ اور اقبال''، شعر و سخن، مانسہرہ، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸، ص ۱۸-۲۱۔

رابرٹ براؤننگ کا شمار عہد وکٹوریہ کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ اقبال کی طرح براؤننگ کو بھی فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔ براؤننگ کا اس کائنات کے خالق اور سزا و جزا کے دن پر پختہ ایمان ہے۔ اقبال کی طرح براؤننگ کو بھی اپنے عہد کی قنوطیت نے مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ فنی حوالے سے براؤننگ نے جس صنف شاعری میں کمال حاصل کیا اسے ڈرامائی مونولاگ کہتے ہیں۔ ڈرامائی مونولاگ میں کردار مختلف ادوار، مختلف اقوام سے لیے گئے اور ان کی زندگی کا دلچسپ نفسیاتی اور روحانی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اقبال کی بھی کئی نظمیں ایسی ہیں جن کو ڈرامائی نظمیں کہا جاسکتا ہے۔ بعض میں فرضی کردار بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں شعرا کی بعض نظمیں آپس میں گہری مماثلت رکھتی ہیں۔ مثلاً (incident of French Camp) اور اقبال کی ''جنگ یرموک کا ایک واقعہ'' تقریباً ایک جیسی نظمیں ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں عرب اور براؤننگ نے اٹلی کے قدرتی مناظر دکھائے ہیں۔ دونوں شعرا کے لیے فطرت انسان سے الگ اپنی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کی طرح انتھک محنت اور جہد مسلسل اس کا بھی پسندیدہ موضوع ہے۔ براؤننگ اور اقبال کی شاعری نہ صرف دکھی انسانیت کے لیے امید کا پیغام ہے بلکہ بھٹکے ہوئے انسانوں کے لیے مشعل راہ کا کام بھی دیتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر اسرار احمد، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ اور حالاتِ حاضرہ''، میثاق، لاہور، اپریل ۲۰۰۸، ص ۶۳-۱۰۰۔

علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ان کی آخری ایام کی نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ درحقیقت اُن کے عمرانی فکر کی معراج ہے۔ قریباً ۸۰ سال قبل لکھی گئی اس نظم میں علامہ نے ابلیس کی ایک مجلس شوریٰ کا نقشہ کھینچا ہے جس میں آج کے تمام حالات کا نقشہ بھی پوری طرح موجود ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار صدر مجلس کے افتتاحی خطاب پر مبنی ہیں جن میں ابلیس نے اپنے خیالات اور طریقہ کار کو بیان کیا ہے۔ اس خطاب میں ابلیس نے تاریخی زبان میں اور حال و مستقبل کی طرف اشاروں کے ذریعے اپنی بات کو واضح کیا ہے اور دراصل یہ ساری تقریر عہد حاضر کی استعماری قوتوں کے طریقہ کار اور ان کی خفیہ و علانیہ پالیسیوں سے بحث کرتی ہے۔ ان کی اصلیت سے پردہ کشائی کرتی ہے حتیٰ کہ مسلمان بھی ابلیس کے دامِ تزویر میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ملا وصوفی کی نفسیات بیان کرتے ہوئے ان کی منصبی ذمہ داری یاد دلائی گئی ہے۔ مومن کے ایمان کی کمزوری اور دین کے احکام کو بدل ڈالنے کی روش کا ذکر کیا گیا ہے۔ جمہوریت کی غوغا آرائی اور ملوکیت کی مضرت رسانی کے درس بڑے سہانے نظر آتے ہیں مگر یہ ان کے اپنے تیار کردہ لبادے اور لباس ہیں وہ جس کے لیے چاہتے ہیں بادشاہی کو جمہوری لباس پہنا دیتے ہیں لیکن کائنات میں انسان کا منصب اور مقصود یہ نہیں ہے۔ مغربی جمہوریت خود اندر سے تاریک اور بیرون سے چمکدار ہے۔ ابلیس کی اس گفتگو میں اس کے مشیر بھی شامل ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اس نظام حکمرانی کی توضیحات پیش کرتے ہیں۔ اس کا تجزیہ بھی کرتے ہیں کہ کیا چیز کتنی مناسب و مفید ہے اور کیا غیر مفید اور ضرررساں ہے۔ ابلیس کے مرید کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام جادوگر تیرے مرید ہیں مگر وہ ہمارے لیے بااعتماد نہیں کہ کہیں وہ کسی قدیم روح کا عکس نہ بن جائیں جو ہمارے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے دیں۔ ابلیس کے مشیران و مریدان کمیونزم، یہودیت، کارل مارکس کے خیالات، مغربی تہذیب کے دجالی فتنے کا ذکر کرنے کے بعد ان کے بے فائدہ ہونے کی بات کرتے ہیں۔ لیکن ابلیس ان میں سے کسی سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی کمزوریاں بیان کرتا ہے۔ البتہ امت مسلمہ سے خوفزدگی کا اظہار ضرور کرتا ہے اور پھر اس کے خصائص وخوبیاں بیان کرتا ہے اور اس کی خامیاں اور کمزوریاں بھی عیاں کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ کہیں شریعت محمدؐ آشکار نہ ہو جائے اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہمارے لیے کہیں جائے پناہ نہیں ہوگی کیوں کہ اسلام کے نظام میں عدل و انصاف موجود ہے۔ وہ زمین پر امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کا ضامن ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس کو الٰہیات کے کلامی مسائل میں الجھا رہنے دیا جائے تا کہ ہمیں گوشۂ عافیت میسر رہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر خالد علوی، ''اقبال اور حدیث''، فکر و نظر، اسلام آباد، جنوری - مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۲۵-۶۴۔

بدقسمتی سے پاکستان کے کچھ طبقات اقبال کو متجددین کا امام ثابت کرنے پر مصر ہیں۔ ان کی اسلامیت کو تجدد کا چولا پہنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے سب سے زیادہ لوازمہ علامہ کے خطبات سے حاصل کیا گیا۔ اس کشید کے لیے اقبال کا چھٹا خطبہ استعمال کیا گیا۔ دراصل استعماری طاقتوں نے اپنے غلبے کے بعد یہ حکمت عملی وضع کی کہ مسلمانوں کے لیے اپنی روایت، دینی اساس اور علمی اثاثے پر اعتماد کو متزلزل کیا جائے۔ یہ کام مغرب کے اہل علم نے سنبھالا اور قریباً تمام موضوعات پر معتدبہ لٹریچر تیار کیا۔ گولڈز یہر اِن میں سے ایک نام ہے جس نے حدیث پر کام کیا۔ یہ سوء اتفاق ہے کہ علامہ کے دور میں گولڈز یہر کا طوطی بول رہا تھا اور مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان نئی تحقیقات کے سحر میں تھا۔ چونکہ اُردو اور انگریزی میں اس موضوع پر کوئی زیادہ کام نہیں ہوا تھا اس لیے علامہ اس حوالے سے مختلف سوالات اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ تاہم علامہ کا حدیث رسول پر اعتقاد و یقین کسی شک و شبہہ سے بالاتر ہے البتہ وہ نقد حدیث سے واقفیت رکھنے والے دانشور کی حیثیت سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایک قانون دان کی حیثیت سے علامہ کے سامنے اصل مسئلہ احادیثِ احکام کی حجیت کا تھا اور یہ فکرمندی درست ہے البتہ جو بات واضح نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اقبال کے سامنے اصولِ حدیث کے رجال فن کی آرا تھیں یا نہیں؟ علامہ کے استفسارات میں اصول فقہ کی کتابوں کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن اصول حدیث کی کسی کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔ احادیث کو دین کا ماخذ تسلیم کرنے کے باوجود قانونی احادیث کی عالمگیریت اور ابدیت کے بارے میں شکوک و شبہات کا ایک سبب مغربی محققین کے نتائج تھے دوسری وجہ شاہ ولی اللہ کی رائے ہے۔ قانونی احادیث کی عالمگیریت اور ابدیت دراصل وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں علامہ الجھن کا شکار ہیں اور اس کا سبب یہی ہے کہ انھیں اسلامی فقہ کے لٹریچر میں اس کی کوئی واضح اساس نہیں ملی۔ بہرحال عمومی طور پر حدیث کے بارے میں ان کی رائے مثبت ہے۔ انھوں نے نظم و نثر میں احادیث سے استدلال کیا ہے حتیٰ کہ ضعیف اور موضوع احادیث سے بھی استشہاد کیا ہے۔

☆☆☆

محمد فیصل مقبول عجز، ''اقبال کے نظامِ فکر میں سائنسی علوم کی اہمیت''، اخبار اُردو، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۳-۲۰۔

علامہ اقبال سائنسی علوم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے نہ صرف سائنسی علوم سے بحث کی ہے بلکہ بہت سے سربستہ رازوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ علامہ جدید علوم و فنون بالخصوص علم فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، علم نجوم اور ان سے متعلقہ دیگر علوم سے بحث کرتے ہیں۔ طبیعیات میں وہ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کی حمایت کرتے ہیں اور حرکت و سکون اور زمان و مکاں کے مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ اس عہد تک پیش کیے گئے مروجہ سائنسی نظریات مثلاً کوپرنیکس، ٹائیکو براہو، میکس پلانکس اور نامور علم سائنس

دانوں کے نظریات پر بھی بحث کرتے ہیں حتیٰ کہ ایٹمی طبیعیات پر بھی علامہ نے بات کی ہے۔علم فلکیات پر بات کرتے ہوئے وہ قدیم و جدید مسلم و غیر مسلم اہل علم کی آرانقل کرتے اور ان کے درمیان ترجیح قائم کرتے نظر آتے ہیں۔علم نجوم کے بارے میں مروج باطل نظریات کی نفی کرتے ہیں۔اسی طرح کیمیا، حیاتیات اور قدرتی آفات کے حوالے سے بھی بہت مفید مطلب بحث کرتے ہیں۔اقبال کے نزدیک اس کائنات کی تسخیر کے لیے ضروری ہے کہ انسان آیاتِ الٰہیہ پر غور وفکر کرے اور ایسے ذرائع تلاش کرے جن کی بدولت وہ فی الحقیقت فطرت پر غلبہ پاسکے۔

☆☆☆

محمد شفیع بلوچ،''علامہ اقبال اور ابن عربی''، پیام، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۹-۲۹۔

علامہ اقبال اور شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کے درمیان ذہنی روابط اور فکری فاصلوں کی عجب گریز وکشش کی سی صورت نظر آتی ہے۔شیخ کے افکار وخیالات کے بارے میں علامہ کی اپنی ایک رائے تھی جو مختلف ادوار میں مختلف رہی۔پہلے دور (۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک) علامہ شیخ اکبر کے نظریۂ وحدت الوجود کے قائل تھے۔دوسرے دور میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۷ء تک ہے۔انھوں نے ابن عربی اور ان کے نظریات سے اختلاف کیا۔آخری دور میں انھوں نے اپنی کتب پیامِ مشرق اور ارمغانِ حجاز میں وحدت الوجودی افکار کو سمویا ہے۔شواہد سے یہ بات محقق ہوتی ہے کہ اقبال ایک خاص مرحلے کے علاوہ کبھی وحدت الوجود کے مخالف نہیں رہے۔اور اقبال اس تصور میں شیخ اکبر کے نظریہ سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کے خوشہ چین بھی تھے۔

☆☆☆

آیت اللہ سید علی خامنہ ای،''علامہ اقبال، مشرق کا بلند ستارہ''، پیام، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۵-۲۸۔

اقبال نے مختلف طرزوں مثلاً ہندی اور خراسانی وغیرہ میں شعر کہے تھے اور تمام طرزوں میں اچھے شعر کہے ہیں۔انھوں نے فارسی میں جس اعلیٰ ادبیت کے حامل شعر کہے ہیں اس کی حیثیت بہت نمایاں ہے حالانکہ وہ مروجہ فارسی بولنے اور لکھنے والے نہیں تھے۔اقبال محض شاعر نہیں بلکہ ایک عظیم مصلح اور حریت پسند رہنما ہیں۔اور ایسے حریت پسند رہنما جو کسی ایک خطے کو درسِ حریت نہیں دیتے بلکہ پورے مشرق اور اسلامی دنیا کو یہ سبق پڑھاتے ہیں۔اقبال کی عظمت کو جاننے کے لیے اس عہد کے معاشرے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی وعلمی رجحانات اور مسائل کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔اس وقت کا ہندوستان کن حالات سے گزر رہا تھا اور اس کو کیسی حکمت عملی کی ضرورت تھی اس کو محسوس کرنے والا فرد دراصل ایک عظیم دانشور اور مفکر ہی ہوسکتا تھا جو علامہ اقبال کے سوا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

جاوید احمد غامدی، ''یومِ اقبال پر خطاب''، اشراق، لاہور، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۲-۵۔

اقبال نے قومیت کا ایک تصور پیش کیا تھا آج علامہ اقبال کے تصورِ قومیت کے حوالے سے نظریے اور عمل کا جو تصادم پیدا ہو گیا ہے وہ ہماری نئی نسل کے ذہن میں ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیابی کا خواب بھی دیکھا تھا۔ ہم نے اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جو لائحۂ عمل اختیار کیا ہے وہ درست ہے؟ اقبال نے شریعت کے موجودہ ڈھانچے کو دعوت کے لیے موزوں خیال نہیں کیا تھا مگر یہ المیہ ہے کہ کسی نے اسے لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ ان مسائل کی نوعیت محض افراد کی غلطیوں کی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ اب ملت کے گناہ بن گئے ہیں اور ان پر توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔

☆☆☆

ناصر عباس نیر، ''اقبال اور جدیدیت''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۳-۲۰۔

اقبال نے ماڈرن ازم سے راست ربط ضبط نہیں رکھا مگر ماڈرن ازم کے بعض تصورات اور اقبال کی شاعری کے بعض موضوعات میں تقابل و تماثل دلچسپی سے خالی نہیں۔ ماڈرن ازم کی تجربہ پسندی، روایت شکنی، تاریخی و جمالیاتی عدم تسلسل اقبال کے یہاں اپنے مغربی سیاق کے ساتھ موجود نہیں۔ انھوں نے نئی ہیئتوں کی تلاش کی بجائے روایتی ہیئتوں کو ہی اپنے لیے موزوں سمجھا ہے۔ تاہم اسلوبی سطح پر اقبال نے تجربہ پسندی اور روایت شکنی کا مظاہرہ ایک خاص مفہوم میں بہر حال کیا ہے۔ اقبال ماڈرنیٹی کے نکتہ چیں بھی تھے اور مداح بھی۔ اقبال دراصل اپنی اسلامی ثقافتی نہاد کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے مغربی جدیدیت سے اخذ و استفادے کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک خاص مفہوم میں یہ ایک جدید اور ترقی پسندانہ نقطۂ نظر تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر رفیق احمد، ''اقبال کے تمدن دوست معاشی تخیلات''، (قسط اول)، نظریۂ پاکستان، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۳۷-۴۱۔

اگرچہ علامہ اقبال معروف معنوں میں ماہر معاشیات نہیں تھے لیکن ان کے فلسفیانہ اور عمرانی نظریات کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس کے اندر انسان کے معاشی مسئلے کو ایک مؤثر منطقی انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ معاشی فلاح و بہبود کا مقصد انسان کی ذات اور اس کے حوالے سے ان کی تہذیب وتمدن کی حفاظت اور پرورش ہے۔ اقبال کی جن نثری تحریروں میں معاشی معاملات پر رائے زنی کی گئی ہے۔ ان میں علم الاقتصاد کے علاوہ درج ذیل مضامین شامل ہیں: قومی زندگی، ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۰ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں کی گئی تقاریر، خطبۂ الٰہ آباد، خطبہ لاہور ۱۹۳۰ء، خطبۂ لاہور ۱۹۳۲ء (آل انڈیا مسلم کانفرنس)، ضبط تولید پر تحریر (رسالہ الحکیم نومبر ۱۹۲۷ء)، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کو لکھے گئے خطوط...... علاوہ ازیں ان کی شاعری اور نجی گفتگوئیں بھی اس ضمن میں معاون ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر مظہر حامد، ''اقبال کے بعد شاعری میں ہیئت اور اسالیب کے نئے سانچے''، الاقربا، اسلام آباد، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۶-۱۵۵۔

اظہار کا وہ سانچہ جسے چند اجزائے ترکیبی کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے ہیئت کہلاتا ہے۔ ہیئت کے طور پر اپنی شناخت رکھنے والے اصناف ادب یہ ہیں: قصیدہ، غزل، واسوخت، رباعی، قطعہ، مرثیہ، مستزاد، مربع، مخمس، مثنوی، ترجیع بند، ترکیب بند، نظم معریٰ، آزاد نظم، مثمن سانیٹ وغیرہ۔ اردو شاعری نے جو نیا طرز اختیار کیا اس نئے رجحان میں مغربی اثرات کی چھاپ نمایاں رہی۔ اقبال کی شاعری میں ہیئت کے تجربوں کو تلاش کریں تو کوئی نیا تجربہ نہیں ملتا جسے ہم ان کی ذات سے منسوب کریں۔ تاہم انھوں نے ترکیب بند اور ترجیع بند کو اپنے فکری اظہار کے لیے نہ صرف منتخب کیا بلکہ انھیں اس انداز سے برتا کہ ان میں ایک نئی روشنی اور ایک نئی توانائی پیدا ہوگئی۔ اقبال نے اپنے عہد کی سب سے مقبول اور پامال صنف یعنی غزل کو صرف عشقیہ مضمون تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ ایک تنگ دائرے کو توسیع دے کر فکر و خیال کے لامحدود بحرنا پیدا کنار کی عظمت عطا کر دی۔ اقبال کی شاعری میں تخاطبی اسلوب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ نظموں میں حرف ندا یعنی خطاب کا وہ منفرد انداز ہے جو ہمیں اقبال سے پہلے نہیں ملتا۔ دوسری خاص بات جو نظموں میں پائی جاتی ہے وہ پیام رسانی ہے۔ اقبال نے اپنے حکیمانہ انداز اور فلسفے سے غور و فکر کا جو نظام مرتب کیا وہی ان کا اسلوبیاتی طرز کہلایا۔ اقبال کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ کو تراکیب و تشبیہات کے ذریعے نئے معنی عطا کیے اور یہی عمل ان کا فکری اجتہاد ہے۔ اقبال نے اپنے ہم عصر شعرا کو اپنے افکار، موضوعات، ہیئت اور اسلوب سے اس قدر متاثر کیا کہ اس کی ہر جہت کی تقلید کی گئی۔ اقبال کے معاصرین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ اقبال کے فکر و فن کی دنیا بہت وسیع ہے۔ زبان و اسالیب کے لحاظ سے بیسویں صدی میں صرف اقبال ہی وہ واحد شاعر ہے جس نے اپنے بعد کے شعرا کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ نئی راہوں سے روشناس کرایا۔

☆☆☆

نسیم عباس، ''اقبالیات اور قرۃ العین حیدر''، الاقربا، اسلام آباد، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸، ص ۱۵۶-۱۶۹۔

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں علامہ اقبال کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور انھیں بیسویں صدی کا بہترین شاعر تصور کرتی ہیں۔ علامہ اقبال کی عظمت کا واضح اور ٹھوس ثبوت پیش کرتی ہیں کہ یو این او کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق پاکستان کے عظیم اور قومی شاعر کی کتب کو اہمیت حاصل ہے۔ قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ترقی اور ادیبوں کی اصلاح کے لیے اقبال ایوننگ قائم کرنے کی خواہاں تھیں تاکہ دور جدید کے ادیب علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے آگاہ ہوسکیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں برطانیہ میں تگ و دو کی تاکہ لوگ اقبال

کے نظریات کے فروغ کے لیے مزید کوشاں ہوں۔قرۃ العین پاکستانیوں کے بارے میں اظہار تعجب کرتی ہیں کہ پاکستانی اپنے قومی شاعر کے متعلق اس قدر آ گاہ نہیں جس قدر ہندوستانی آ گاہ ہیں۔قرۃ العین حیدر کے نزدیک اقبال کے افکار و نظریات سے فقط ادبا ہی مستفید نہیں ہو رہے بلکہ بڑے بڑے روسا اور نواب کلام اقبال سے زندگی کے تلخ حقائق کا حل تلاش کرتے ہیں۔قرۃ العین نے اپنی تصانیف میں افسانوں اور ناولوں کے موضوعات میں جابجا علامہ اقبال کے افکار و نظریات علامات و اصطلاحات اور اشعار سے خوب صورتی پیدا کی ہے۔حکومتِ ہند نے انھیں ''اقبال سمان'' کا ایوارڈ بھی ۱۹۸۷ء میں عطا کیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر عاصی کرنالی، ''اقبال اور نوجوان''، الاقربا، اسلام آباد، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۴-۱۲۵۔

علامہ اقبال اس رمز سے آشنا تھے کہ نوجوان ہی ملت اسلام کے وہ افراد ہیں جو اس کی قسمت کے تابناک ستارے اور اس کے مستقبل کے نگہبان ہیں، اس لیے ان کی ذہنی اور فکری تربیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔اس تربیت کے لیے صحیح خطوط مرتب ہونے چاہییں۔اس تربیت کا سرچشمہ قرآن وسنت کی تعلیمات اور اپنے دین و تہذیب کی روشن قدریں ہی ہوسکتی ہیں۔اقبال کی شاعری اور نظام فکر کی یہ خوبی ہے کہ وہ کسی غلط بات پر صرف تنقید یا نکتہ چینی ہی نہیں کرتے بلکہ متبادل صورت تجویز کرتے ہیں ان کے نزدیک وہی تعلیم درست ہے جو نوجوانوں کو خدا اور رسول سے وابستہ رکھے، جو قرآن کی روشنی اُن کے قلب میں اُتارے۔اصل میں اقبال نوجوانوں میں ذوق عمل اور جوش عمل کا جوہر دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک عمل زندگی ہے اور بے عملی موت ہے۔جاوید کے پردے میں اقبال تمام نسل نو کے ہر فرد کو حسن، خیر اور صداقت کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ بڑی دردمندی کے ساتھ خدائے کارساز کی بارگاہ میں نوجوانوں کی اصلاح کے لیے دعا گو ہیں۔

☆☆☆

محمد اسماعیل قریشی، ''علامہ اقبال بہ حیثیت مفسر قرآن''، الاقربا، اسلام آباد، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۷-۱۱۳۔

علامہ اقبال کی ہمہ گیر شخصیت ان کی شاعری، ان کے فلسفے، آرٹ، تہذیبی اور تمدنی ارتقا اور بے خودی کے اسرار و رموز، زندگی کے مسائل اور حقائق کے بارے میں ان کے افکار عالیہ پر گراں قدر تصانیف موجود ہیں جن کا ماخذ ان کی شاعری، ان کے خطبات اور ان کے سفر اور حضر کی مجالس کی نکتہ رس گفتگو ہے۔علامہ کی زندگی کا ایک پہلو جس کا تعلق قرآن حکیم سے ہے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔سازِ سخن یا شاعری سے وہ مسلمانوں کے ہجوم آوارہ کو قرآن کی پکار پر پوری قوت کے ساتھ متحد کرنا چاہتے ہیں۔یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس کے دل میں قرآن اپنے جمال وجلال کے ساتھ اتر گیا ہو۔قرآن سے اسی ربط و تعلق

کی وجہ سے ان پر حقیقت آشکار ہوئی کہ قرآن انسانی زندگی کو اس کائنات میں اور اس سے بھی آگے کی دنیا میں کن بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ قرآن کے حقائق اور معارف کی روشنی میں علامہ نے کلام الٰہی کی تعبیر و تفسیر پیش کی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری، ''اقبال کا ورودِ کشمیر''، حکیم الامت، بڈگام، اپریل ۲۰۰۸ء، ص۴-۷۔

علامہ اقبال جون ۱۹۲۱ء میں پہلی اور آخری مرتبہ کشمیر تشریف لائے اور یہاں دو ہفتے قیام فرمایا۔ انھوں نے کشمیریوں کی پریشان کن حالت دیکھی۔ اقبال نے ساقی نامہ کے عنوان سے نظم نشاط باغ سری نگر میں لکھی اور اس کے ذریعہ کشمیریوں میں نئے سرے سے خود اعتمادی کی روح ڈالی۔ علامہ ۱۸۹۵ سے کشمیریوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کر رہے تھے اور ان کے ہر دکھ درد میں شریک رہتے تھے لیکن وہ کشمیر کے روشن اور درخشندہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ایسا زرخیز ملک، ایسے روشن دماغ اور ذہین و ذکی لوگ اور ایسی صناع و ہشیار قوم ہمیشہ کے لیے کبھی غلام نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی ریاستوں کی چھ کروڑ آبادی میں سب سے پہلے کشمیر کے لوگوں ہی نے جبر و تشدد کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی ریاستوں کی رعایا نے بھی قدیم نظام حکومت بدلوانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔

☆☆☆

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ''کلام اقبال میں گلِ لالہ کے رنگ''، اخبار اُردو، اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۸ء، ص۲-۶۔

شعریات اقبال میں لالہ کی علامت کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اندازہ ہے کہ ان کے ہاں تقریباً دوسو مقامات پر لالہ کا ذکر آیا ہے جو ان کی اس پھول سے وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اقبال نے لالہ کے گونا گوں ابعاد کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی معنی خیز فضائیں تشکیل دی ہیں۔ یہ علامت ایک ارتقائی کیفیت بھی رکھتی ہے اور علامہ کے مختلف ادوارِ شعری میں اس کے نئے نئے رنگ نظر آتے ہیں۔ اقبال کی شعری علامتوں میں لالہ غالباً ایک ایسی واحد علامت ہے جو معنوی تصورات کی بے شمار سطحوں کا اظہار کرتی ہے۔ لالہ جذبہ عشق کی نکھری ہوئی صورت کے طور پر شوق شہادت کا عکاس بھی ہے اور محض حسن و رعنائی کی علامت بھی۔ خاص طور پر جب اقبال اسے تہذیب حجازی کی علامت کے طور پر متعارف کراتے ہیں تو لطف دوگونہ ہو جاتا ہے۔ اقبال لالے کی آتش قبائی، خودروئی، دل سوزی، سرخوشی و رعنائی اور چاک پیرہنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس رمز بلیغ و دلنشین کو تلقین عمل کے لیے بھی بڑی خوبی سے برتتے ہیں۔ اور وہ دقیق سے دقیق معانی اس پھول کی وساطت سے ادا کرتے ہیں۔

☆☆☆

حسین البنا، ''اقبال اور جمہوریت''، اخبار اُردو، اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۸، ص ۷-۹۔

اقبال یورپی اور امریکی جمہوریت سے نفرت کرتے تھے کیوں کہ ان کی جمہوریت سرمایہ داری کے اثرات سے آزاد نہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جمہوریت اپنی ایک خاص شکل میں موجود تھی۔ اس میں شوریٰ کا تصور بنیادی تھا اور انتخاب گویا قبائل کے نمایاں افراد کے ذریعے سے تھا۔ اس میں تنقید کی بھی اجازت تھی مگر اموی دور میں اس کی جگہ شہنشاہیت نے لے لی۔ اقبال اسلامی جمہوریت کو پسند کرتے تھے کیوں کہ اسے سماج میں زیادہ آزادی ملتی ہے اور اس جمہوریت میں تنقید کی بھی اجازت ہے۔ اقبال اشتراکیت کو پوری طرح پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ جمہوریت میں سماج کا ایک طبقہ ظالم اور طاقتور بن جاتا ہے جب کہ اشتراکیت میں سماج کا ایک طبقہ کمزور سے کمزور تر بن جاتا ہے۔ عوام دوستی، جمہوریت پسندی، سماجی مساوات، اخوت انسانی پر ایمان رکھنے کے باوجود اقبال کی حقیقت بین نظریں مغربی جمہوریت کے تاریک باطن کو بھی دیکھ لیتی ہیں۔ اقبال نے جمہوریت کے تصور پر تنقید کو اپنے کلام میں واضح طور پر پیش کیا۔